مولانا مودودیؒ کے معاشی افکار

——————— ڈاکٹر اوصاف احمد

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو سماجی علوم میں معاشیات سے شروع ہی سے دل چسپی رہی ہے۔ انھوں نے اپنے تصنیفی دور کے آغاز ہی میں ایک صحافی کی حیثیت سے ہندوستان کے صنعتی زوال اور اس کے اسباب پر ۱۹۲۴ء میں گفتگو کی اور اس ذیل میں اسلام کی تعلیمات کی طرف بھی اشارے کیے۔ ڈاکٹر اوصاف احمد نے ذیل کے مضمون میں اس تحریر کا اور بعض دوسری تحریروں کا معاشی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ہے۔ بعد کے دور میں مولانا مودودیؒ نے جب اسلام کو ایک نظامِ حیات کے طور پر پیش کرنا شروع کیا تو مختلف مناسبتوں سے معاشیات کے سلسلے میں اسلام کے نقطۂ نظر کو واضح کیا۔ مولانا کی ان تمام تحریروں کو محترم پروفیسر خورشید احمد نے 'معاشیاتِ اسلام' کے عنوان سے ۱۹۶۹ء میں کتابی شکل دے دی تھی جسے مولانا مودودیؒ نے پسند کیا تھا اور کہیں کہیں ضروری اصلاحات اور اضافے بھی کیے تھے۔ اس وقت سے یہ کتاب شائع ہو رہی ہے۔ حال میں اس کا انگریزی ترجمہ جناب امام شفیق ہاشمی سینیر ریسرچ فیلو انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد نے First Principles of Islamic Economics کے نام سے کیا ہے۔ اس میں مولانا مودودیؒ کے بعض ان مضامین کا ترجمہ بھی موجود ہے، جو 'معاشیاتِ اسلام' میں شامل نہیں تھے۔ ترجمہ کی خوبی کے لیے اتنی بات کافی سمجھی جائے گی کہ پروفیسر خورشید احمد نے اس کی تعریف کی ہے۔ اس ترجمہ پر پروفیسر خورشید احمد نے موجودہ معاشی بحران کے پس منظر میں ایک مبسوط مقدمہ تحریر کیا ہے۔ اس نے کتاب کو اپ ڈیٹ کر دیا ہے۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ خورشید صاحب نے مولانا مودودیؒ کے بنیادی افکار کو انگریزی میں منتقل کرنے کے لیے ۱۶ جلدوں پر مشتمل ایک بڑا پروجیکٹ تیار کیا ہے۔ یہ کتاب اسی کا حصہ ہے۔ اس پروجیکٹ کو آگے بڑھانے کی ذمہ داری ڈاکٹر انیس احمد نے لی ہے، جو رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد کے وائس چانسلر ہیں۔ (جلال الدین)

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صرف اسلامی علوم کے ماہر اور عہد جدید میں احیائے اسلام کے داعی ہی نہ تھے، وہ عہد جدید کے ایک باخبر انسان بھی تھے۔ اگر ایک طرف ان کا رشتہ قرآن پاک، حدیث، تفسیر اور فقہ جیسے اسلامی علوم سے استوار تھا تو دوسری جانب وہ سیاسیات، معاشیات، بنک کاری، سماجیات اور قانون جیسے جدید علوم سے بھی اتنے ہی واقف تھے جتنا کہ عہد جدید کے کسی انسان کو ہونا چاہئے۔ خدائے بخشندہ نے انھیں وہ ذہن رسا عطا کیا تھا کہ جس علم میں بھی انھیں دلچسپی محسوس ہوئی اس کی رفعتوں کو چھو لیا۔ فہم وادراک کی وہبی صلاحیتوں کو انھوں نے اپنی محنت شاقہ سے صیقل اور غور وفکر کی وادیوں کو اپنی بصیرتوں سے منور کیا۔ عہد جدید کے انسان کی حیثیت سے اپنے زمانہ کے معاشی مسائل ان کی توجہ کے دائرے سے باہر نہ ہو سکتے تھے۔ آئندہ سطور میں مولانا مودودی کے معاشی افکار پر مختصر روشنی ڈالی جائے گی، تاہم ابتدائی مرحلہ میں ہی ہمارے لیے مشہور اقتصادی مفکر محمد عمر چھاپرا سے اتفاق کر لینا نامناسب نہ ہوگا جنھوں نے لکھا ہے:

''سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کوئی پیشہ ور ماہر اقتصادیات نہیں تھے، بلکہ بنیادی طور پر وہ ایک مصلح تھے، لہٰذا یہ توقع کرنا مناسب نہیں ہوگا کہ انھوں نے اقتصادیات کے نظریاتی اور علمی مباحث میں حصہ کیوں نہیں لیا۔ ان کا اصلی مطمحِ نظر اسلامی شریعت کے مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے نوعِ انسانی کو فلاح کے راستہ پر گامزن کرنا تھا، چنانچہ انھوں نے نسلِ انسانی کے مسائل کا تجزیہ کرنے اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اُن کا حل پیش کرنے کی کوشش کی''[۱]

مولانا مودودیؒ کی حیات مستعار (۱۹۰۳-۱۹۷۹ء) کا زمانہ بڑی قیامت خیز تبدیلیوں اور اُتھل پتھل کا زمانہ تھا[۲] دو بڑی جنگوں کے علاوہ اس زمانے میں کئی چھوٹی مگر اہم جنگیں ہوئیں، مثلاً کوریا کی لڑائی، ویتنام کی جنگ، برصغیر کی تقسیم، فلسطین کی لڑائی وغیرہ۔ ان جنگوں کے دنیا کی معاشی صورت حال پر دوٗر رس اثرات مرتب ہوئے۔ ان کے علاوہ یہ زمانہ نوآبادیاتی نظام کے عروج وخاتمہ، اشتراکیت کے قیام وانہدام اور بے مثال صنعتی ترقی کے لیے بھی مشہور ہے۔ عہد جدید میں معاشی مسائل کی طرف جو توجہ ہوئی اس کی بھی اس سے قبل کے زمانوں میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ چنانچہ ہم خواہ چاہیں یا نہ چاہیں لیکن معاشی امور کی جانب ہمیں

توجہ دینی ہی پڑتی ہے۔ نا قابل تصور ہے کہ ایک حساس ذہن کے مالک ہونے کی حیثیت سے مولانا مودودی معاشی مسائل سے غافل رہتے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کسی معاشی موضوع پر ان کا پہلا مضمون ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا جب کہ ان کی عمر فقط ۲۱ سال تھی، اس کا عنوان تھا ''ہندوستان کا صنعتی زوال اور اس کے اسباب''۔[۳]

ہندوستان کا صنعتی زوال (Deindustrialization of India) ہندوستان کی معاشی تاریخ کے مؤرخین کا محبوب موضوع رہا ہے۔ دادا بھائی نوروجی سے لے کر رمیش دت، بی ایم بھاٹیہ اور روی بی سنگھ تک سبھی نے اس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے تو پھر اس میں تعجب کی کیا بات ہے اگر نوجوان مودودی کو بھی اس موضوع میں کشش محسوس ہوئی۔[۴] تعجب ہے تو اس بات پر کہ مودودی کا اندازِ فکر اور اندازِ تحریر معاشیات کے کسی مؤرخ سے کم نہیں اور انھوں نے کم و بیش انھیں مآخذ سے استفادہ کیا ہے جن کا استعمال کوئی ماہر معاشیات کر سکتا ہے۔

اٹھارویں صدی کے اوائل تک ہندوستان ایک معروف صنعتی ملک کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ یہ تو صرف ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے دوران ہوا کہ اس ملک کی صنعتی حیثیت کو زوال ہوا اور اس کے لیے کمپنی نے شعوری پالیسیاں اختیار کیں۔ ملک کی درآمدی اور برآمدی پالیسیاں بدل دی گئیں۔ ہندوستان سے نہ صرف باہر جانے والی اشیاء پر، بلکہ اُس پیداوار پر بھی محصول عائد کیا گیا جو دیسی بازاروں میں فروخت کی جاتی تھی۔ اس کے مقابلہ میں انگلستان سے درآمد کیے جانے والے سامان پر کوئی محصول عائد نہ کیا جاتا تھا۔ اس لیے ہندوستانی بازاروں میں، ہندوستانی اور انگریزی مال کی قیمتوں میں جان بوجھ کر عدم توازن روا رکھا گیا۔ مولانا مودودی فرماتے ہیں:

''لارڈ لٹن کے بعد لارڈ وپن کے عہد میں جب امن و امان قائم ہوا تو حکومت ہند کے وزیر مال سر دوانس ہبرنگ (بعد میں لارڈ کرومر) کو جس بات کی سب سے پہلے فکر ہوئی وہ یہ تھی کہ بقیہ محصول درآمد کو بھی منسوخ کر دیں، چنانچہ انھوں نے ۱۸۸۲ء کے بجٹ کو نمک اور شراب کے سوا تمام حفاظتی محصول کے وجود سے پاک کر دیا۔ البتہ جس چیز کو ان کی عنایات میں سے کچھ بھی حصہ پانے کا حق نہ تھا وہ غریب کسان کے مستزاد محاصل تھے جو ۱۸۷۱ء سے اس پر

عائد کیے جا رہے تھے اور جن سے قحط کے زمانہ میں بھی چھٹکارا نہیں ملا تھا۔ بارہ سال تک یہی حالت رہی۔ اس دوران لارڈ ڈفرن اور لارڈ لینڈون کی غیر معقول فوجی پالیسی نے رپن کے قائم کیے ہوئے مالی توازن کو اس حد تک بگاڑ دیا کہ ۱۸۹۱ء کے بجٹ میں ۲ کروڑ سے زیادہ کا گھاٹا آیا۔ اس کو پورا کرنے کے لیے لارڈ برشل کے زیر صدارت ایک کمیٹی مقرر کی گئی اور اُسے صرف یہ اختیار دیا گیا کہ مزید ٹیکس عائد کرنے کے احکامات پر غور کرے۔ کمیٹی نے مارچ ۱۸۷۴ء میں رپورٹ پیش کی کہ محصول درآمد (Import Duty) دوبارہ عائد کرنے کے سوا کوئی ذریعہ ایسا نہیں جسے اختیار کیا جا سکے..... مگر سوتی کپڑا بدستور معافی کی فہرست میں رہنے دیا گیا..... مگر اس کے ساتھ ہی ہندوستانی ملوں کی پیداوار پر بھی ۵ فیصدی محصول لگا دیا گیا، تاکہ منکاشائر اور بمبئی دونوں ایک سطح پر آ جائیں۔''[۵]

مقالہ کے آخر میں مولانا مودودی بعض ممالک کا بین الاقوامی موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آج سے ۵۰ سال قبل (یعنی ۱۹۲۴ء سے ۵۰ سال قبل) جاپان اپنی تعلیمی، صنعتی حتی کہ زرعی حیثیت سے بھی ہمارے مقابلے میں بہت بہتر ہوا تھا۔ مگر اب وہ اپنی روشن خیال خدمت کی بدولت اس قدر ترقی کر گیا ہے کہ امریکا اور انگلستان کے بعد دنیا میں کوئی اس کا ہمسر نہیں۔ اب سے ۶۰ سال پہلے جرمنی ہم ہی جیسا ایک زراعتی ملک تھا اور اس کی آبادی میں ۶۵ فی صد باشندے زمین کی قوت نامیہ پر اپنی زندگی بسر کرتے تھے، مگر کامیاب رہنمائی کا آج ہم یہ نتیجہ دیکھ رہے ہیں کہ وہ دنیا کے صنعتی ملکوں کی پہلی صف میں ہے۔''

ماہرین معاشیات کی اصل دلچسپی یہ جاننے میں رہی ہے کہ کیا نوآبادیاتی عہد میں برطانوی حکومت نے ہندوستان کا استحصال کیا اور کیا واقعی ہندوستان سے دولت کا اخراج ہوا۔ معاشیات کی اصطلاح میں یہ تصور نظریہ اخراج (Drain Theory) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ دوم یہ کہ کیا ہندوستان سے لوٹی گئی اس دولت نے دولت برطانیہ کی صنعتی ترقی میں کوئی کردار انجام دیا؟ اس زاویۂ نظر کے تحت معاشی ماہرین کی توجہ اس بات پر رہی کہ وہ اخراج دولت (Economic Drain) کا تخمینہ تیار کریں، پھر اس کا موازنہ برطانیہ میں جمع ہونے والی

نفع کی مقدار سے کریں، تاکہ برطانیہ میں ہونے والے Acculation of Capital میں ہندوستانی معیشت کے استحصال کے کردار کا علمی محاکمہ کیا جا سکے۔

اکثر ماہرینِ معاشیات ہندوستان کے استحصال کے موضوع پر قومیت کے حساب سے بٹے ہوئے ہیں۔ زیادہ تر برطانوی ماہرین کا خیال ہے کہ برطانوی ہند کی حکومت دوسری حکومتوں سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی اور برطانوی حکومت نے ہندوستان کا استحصال نہیں کیا۔ مثلاً ویرا انسٹی Veena Anstey ریاست کی معاشی پالیسیوں کو ملک کی بدحالی سے بری الذمہ قرار دیتی ہیں۔ تقریباً ایسی ہی دلیل کیمبرج اکنامک ہسٹری آف انڈیا کے مولفین نے بھی دی ہے۔ دوسری طرف ہندوستانی مؤرخین دادا بھائی نوروجی، رمیش دت، رجنی پام دت، بی این گنگولی، وی وی بھٹ اور بہت سے دوسرے مؤرخین نے برطانوی حکومت کو استحصال کا مجرم قرار دیا ہے۔

ہندوستان کا نوآبادیاتی استحصال

ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کا نوآبادیاتی استحصال کرنے کے لئے کئی ہتھکنڈے اپنائے۔ پہلے تو اس نے ہر جائز و ناجائز طریقے سے ملک کی حکومت ہتھیائی، پھر حکومت کو اپنے منافع کے لئے استعمال کیا۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ کے بعد ہندوستان کا سیاسی اقتدار سنبھالا تو ہندوستانی معیشت بنیادی طور پر جاگیردارانہ تھی، لیکن جواہر لال نہرو اور رجنی پام دت کے خیال میں ہندوستان میں صنعتی سماج کے ارتقا اور سرمایہ دارانہ معیشت کے قیام کے پورے امکانات موجود تھے۔ کمپنی نے تجارت کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ تجارتی محصول نابرابری کے طور پر لگایا گیا۔ ہندوستانی مصنوعات پر اتنا محصول عائد کیا گیا کہ ہندوستانی تاجروں کے لئے صنعتی پیداوار کرنا گھاٹے کا سودا بن گیا۔ تنگ آ کر انھوں نے زرعی پیداوار کے دامن میں پناہ لی۔

کمپنی نے مال گزاری کو استحصال کا وسیلہ بنایا۔ ۱۷۹۳ء میں جب لارڈ کارنوالس نے بندوبست استمراری کا نظام قایم کیا تو ۳۴ لاکھ پونڈ کی مالیت کا محصول مقرر کیا گیا تھا۔ کمپنی اس محصول کو عوام کی فلاح و بہبود کے لئے خرچ نہیں کرتی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ مال گزاری تو اس کا عین منافع ہے۔ حکومت سنبھالنے کے صرف چند سال کے اندر ہی یہ 'منافع' صرف بنگال کی

ریاست سے ۴۰ لاکھ پونڈ سالانہ تک پہنچ چکا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہل کار بد دیانت، غاصب اور رشوت خور تھے۔ لارڈ کلائیو جیسے گورنر جنرل ایک قلاش کی حیثیت سے ہی ہندوستان وارد ہوئے تھے اور جب وہ یہاں سے واپس گئے تو مالا مال تھے۔ مولانا مودودی نے بھی اعداد و شمار کے ذریعہ محصول کی ناانصافی اور غیر مساوی حیثیت کو اجاگر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''ہندوستانی مال کی خوبی کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ۱۸۳۵ء میں ہندوستانی سوتی کپڑے کے ۳ لاکھ ۶۰ ہزار تھان انگلستان گئے۔ یہی حال شکر کا تھا کہ ۱۸۳۱ء میں ۵ لاکھ ۱۹ ہزار بنڈور یڈوٹ شکر انگلستان گئی۔ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان نے برطانیہ کی ضروریات کے ایک چوتھائی حصہ کو پورا کیا۔ مگر چند سال کے بعد ہی یہ نوبت پہنچ گئی کہ وہ خود ان کی ضرورت کے لئے جاوا اور ماریشش سے کروڑوں روپے کی شکر منگوانے لگا۔'' [۷]

اسلام کے عروج نے اُن تمام ملکوں میں علمی مشاغل اور نئے علوم وفنون کو نئی زندگی بخشی جو اسلام کی آمد سے قبل جاہل معاشروں کی حیثیت سے مشہور تھے۔ قرآن کے نزول کے بعد نہ صرف یہ کہ تفسیر، حدیث، فقہ اور اصولِ فقہ جیسے دینی علوم رائج ہوئے بلکہ عربوں کے علم اللسان، علم البلاغۃ، علم الکتابۃ، علم الخطبات اور علم الشعر والادب جیسے غیر دینیاتی علوم کو بھی رواج ملا۔ عباسی عہد کے آتے آتے، عرب معاشرہ اتنا تعلیم یافتہ ہو چکا تھا کہ تراجم سے استفادہ کر سکے۔ چنانچہ فلسفہ، منطق، ریاضی، طبیعیات، کیمیا اور کلیات سے متعلق ہزاروں کتابوں کے ترجمے کیے گئے۔ لیکن بغداد کے سقوط کے وقت اسلامی علوم کا چمکتا سورج گہنا چکا تھا۔ اس وقت بنیادی علوم میں تحقیقی کارناموں کا سلسلہ رک سا گیا اور شرحوں پر شرحیں لکھنے کا رواج پڑا۔ چنانچہ مکھی پر مکھی بٹھائی جانے لگی اور بنیادی اہمیت کے سوالات پس پشت چلے گئے۔

مولانا مودودی علیہ الرحمہ کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ اگر مسلم معاشروں اور مسلم ملکوں کو اپنی عظمت رفتہ کو بحال کرنا ہے تو نہ صرف یہ کہ ہندوستان اور اس کے قرب و جوار کے ممالک بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو سائنس اور علوم جدیدہ کو از سرنو اپنانا ہوگا۔ اُن کے نزدیک یہ بات واضح تھی کہ ساری دنیا کے مسلمانوں کی ترقی کا راستہ اسلام اور سائنس کے پل صراط سے ہوکر ہی گذرتا ہے۔

اپنی ایک تقریر میں مولانا مودودی نے جدید ثقافت کی بابت مسلم ممالک اور عام مسلمانوں کے رویوں کی وضاحت اس طرح کی ہے:

(۱) پہلا رویّہ تو یہ ہے کہ اسلام کے اصولوں کو ہی بدل دیا جائے۔ احکام کی اَن دیکھی نہ کی جائے تو کہہ دیا جائے کہ ان کے وہ معنی نہیں جو برسہا برس سے چلے آتے ہیں اور اہل مغرب نے زندگی کو جن اصولوں پر قائم کر دیا ہے وہی اسلامی ہیں۔

(۲) دوسرا رویہ یہ ہے کہ اضطرار کی بنا پر حرام اشیاء اور افعال کے جائز ہونے کا فتویٰ دیا جائے۔

(۳) تیسرا رویّہ یہ ہے کہ حرام کو حرام کہہ دیا جائے ... مشکل یہ ہے کہ ایک چیز کو حرام بتا دینا کافی نہیں جب تک اس کا بدل نہ بتا دیا جائے۔ ایسا بدل جس سے کاروبار زیست چلتا رہے اور چلتی ہوئی بات کو حرام کہنے کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے ہاتھ رکوا دیئے جائیں اور یوں ہماری گاڑی زیادہ دیر تک چلتی نہ رہ سکے گی۔''

(۴) چوتھا رویہ یہ ہے کہ احکام الٰہی کو ٹھیک ٹھیک مان کر اپنے معاملات پر ٹھیک ٹھیک انطباق کیا جائے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا جائے کہ ایک غلط کام کو ترک کر کے کون سا درست کام اختیار کیا جائے جو قابل عمل بھی ہو اور ہمیں اس قابل بھی بنائے کہ ہم دنیا کی رہ نمائی کر سکیں اور دنیا کے غلط طریقوں کو بدلنے کا کام کامیابی سے کر سکیں۔''[۸]

ذیل میں مولانا مودودیؒ کی دو اہم کتابوں کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے جو ہمارے موضوع سے متعلق ہیں۔

سود

حرمت سود اسلامی معیشت کی وجہ جواز ہے۔ مولانا مودودیؒ کے حق میں یہ بات جاتی ہے کہ انھوں نے ایک غیر پیشہ ور ہونے کے باوجود اس مسئلہ کے مالہٗ و ما علیہ پیشہ ورانہ مہارت سے واضح کیے۔ یہ مولانا مودودی کا کارنامہ تھا کہ انھوں نے کسی معذرت کے بغیر حرمت سود کے بارے میں وہ دلائل دیئے کہ امریکا کے حالیہ معاشی بحران کے بعد سودی معیشت کا کردار بھی معرضِ بحث میں آنے لگا ہے۔ قارئین کو یہ یاد دلانا شاید نامناسب نہ ہو کہ ۱۹۴۰ء کی دہائی میں ڈاکٹر انور اقبال قریشی نے انڈین اکنامک ایسوسی ایشن کے سالانہ جلسے میں ایک تحقیقی

مضمون پیش کیا تھا جس میں سود کے بارے میں اسلام کی معروف تعلیمات کی وکالت اقتصادی بنیادوں پر کی گئی تھی۔ مشہور ماہر معاشیات فنڈ لے شیراز بھی اس اجتماع میں موجود تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر قریشی کے اس مضمون کو مذہبی تعصب کا عملی مظاہرہ قرار دیا۔ اس واقعہ کے تیس سال بعد ۱۹۷۰ء کی دہائی میں، جب راقم الحروف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ معاشیات سے وابستہ تھا، ہمارے ایک ساتھی نے غیر سودی بنک کاری کے موضوع پر ایک مقالہ لکھا اور ایک مؤقر معاشی مجلّہ کو بھیجا۔ جلد ہی انھیں اس مجلّہ کے مدیر شہیر کا جواب موصول ہوا جس میں مقالہ نگار کی جدت طرازی اور افتادِ طبع کے اقرار کے ساتھ یہ اعتراف بھی موجود تھا کہ مذکورہ بالا مضمون مغربی تہذیب کے لیے کسی افادیت کا حامل نہیں۔ اب ۵۰ سال کے اندر ہی صورتِ حال اس قدر تبدیل ہو چکی ہے کہ تمام مغربی مجلّات اسلامی بنک کاری کے موضوعات پر تحقیقی مضامین نہ صرف آب و تاب سے شائع کرتے ہیں، بلکہ اس کے مختلف مباحث بھی ان کے صفحات کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ موقر مغربی اشاعتی ادارے اسلامی معاشیات کے موضوعات پر کتابیں شائع کرتے ہیں۔ نامی گرامی یونیورسٹیاں بھی اسلامی معاشیات اور بنک کاری سے متعلق موضوعات پر تحقیقی ڈگریوں کے قبول کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتیں۔ بلا شبہ اس گہما گہمی کا ایک سبب مولانا مودودیؒ کی تحریریں بھی ہیں۔

مولانا مودودیؒ نے پہلی بار یہ واضح کیا کہ اسلام میں بارآور اور غیر بارآور قروض کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ جس طرح مغربی تہذیب میں ڈالر صرف ڈالر ہے اُسی طرح اسلامی تہذیب میں قرض صرف قرض ہے۔ اس کے بارآور یا غیر بارآور ہونے کی دلیل غیر متعلق ہے۔ اسی طرح شرح سود کے زائد یا مناسب ہونے کی دلیل بھی ناقابل قبول ہے۔ سود ہر حال میں سود ہے۔ یہ کہنا بھی زائد بات ہے کہ صرفی مقاصد کے لیے دیے جانے والے سود میں تو ظلم شامل ہے لیکن تجارتی مقاصد کے لیے دیے جانے والے قرض میں ظلم نہیں ہے۔ اسلامی بنک کاری اور تکافل کے بنیادی خطوط بھی مولانا نے اپنی تحریروں میں واضح کیے۔

اسلام اور جدید معاشی نظریات

اس رسالہ کے دیباچہ میں مولانا مودودیؒ رقم طراز ہیں:

''یہ مختصر رسالہ میری کتاب 'سود' کے ان ابواب کا مجموعہ ہے جو اس سے قبل کتاب

مذکور کے حصہ اوّل و دوم میں شائع ہو چکے ہیں۔ جن حالات میں یہ دونوں حصے مرتب ہوئے تھے ان کی وجہ سے اس کی ترتیب ناظرین کے لئے خاصی پریشان کن بن گئی''۔

چنانچہ ان تمام ابواب کو، جن کا تعلق معیشت کی عام کارکردگی سے تھا، علیحدہ کر کے مذکورہ رسالہ کی صورت میں شائع کیا گیا۔ اس میں جن موضوعات سے بحث کی گئی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱- موجودہ عمرانی مسائل کا تاریخی پس منظر

۲- جدید نظام سرمایہ داری

۳- سوشلزم اور کمیونزم

۴- ردِّعمل (فاشزم اور نازی ازم)

۵- اسلامی نظامِ معیشت کے بنیادی ارکان

۶- جدید معاشی پیچیدگیوں کا اسلامی حل

پہلے باب میں سرمایہ دارانہ نظام کے پیش روؤں، جاگیردارانہ نظام، تحریک اصلاح اور نشاۃ ثانیہ کے عروج سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں جدید نظام سرمایہ داری کے بنیادی اصولوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جس میں شخصی ملکیت کا حق، آزادیٔ سعی کا حق، محرک منافع، مقابلہ اور مسابقت اور ربابت کا عدم مداخلت کے اصولوں کو شامل کیا گیا ہے۔ سرمایہ داری کی خرابیوں میں آدم اسمتھ کے اس مشہور بیان کا حوالہ دیا گیا ہے:

''کم ہی ایسا ہوتا ہے جب کاروباری لوگ کہیں باہم جمع ہوں اور ان کی صحبت پبلک کے خلاف کسی سازش اور قیمتیں چڑھانے کے لئے کسی قرارداد پر ختم نہ ہو''۔

سوشلزم اور کمیونزم کا بھی اسی انداز میں تجزیہ کیا گیا ہے۔ مولانا مودودی کا اصل کارنامہ اسلامی معاشی نظام کے بنیادی ارکان کی وضاحت کرنا تھا۔ یہ کارنامہ اس کتاب کے پانچویں اور چھٹے باب میں ملتا ہے۔ اسلامی نظام کے ممتاز ارکان میں مندرجہ ذیل خصوصیات کا تذکرہ کیا گیا ہے:

۱- اکتساب مال کے ذرائع میں جائز اور ناجائز کی تفریق

۲- مال جمع کرنے (Heording) کی مخالفت

۳- خرچ کرنے کا حکم

۴- نظام زکوٰۃ

۵- قانون وراثت

۶- غنائم اور اموال مغنومہ کی تقسیم

۷- اقتصاد کا حکم

حواشی ومراجع

۱ محمد عمر چھاپرا، اسلامی معاشیات میں مولانا مودودی کی خدمات، سہ ماہی مطالعات، جلد۴، شمارہ۴، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۹ مطابق شوال المکرّم تا ذی الحجہ ۱۴۳۰ھ، ص ۳۳

۲ بعض اعداد وشمار مہیا کرنے کے لئے میں ڈاکٹر وقار انور کا شکرگزار ہوں۔

۳ یہ رسالہ ہمیں جناب ارشد اجمل (نائب صدر، سہولت مائکروفنانس سوسائٹی) کی عنایت سے دستیاب ہوا۔

۴ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ مقالہ سب سے پہلے لکھنؤ کے مشہور جریدہ نگار کی تین قسطوں (اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۲۴ء) میں شائع ہوا تھا۔ پہلی قسط میں جناب نیاز فتح پوری (مدیر نگار) نے اپنا نام بہ حیثیت مقالہ نگار دے دیا تھا۔ (ہندوستان کا حتمی زوال اور اس کے اسباب صفحہ:۶) مودودی صاحب کے بیان کے مطابق ''یہ مضمون ان کی برسوں کی محنت و مشقت کا نتیجہ تھا'' بقیہ دونوں قسطیں اُن کے نام سے مدیر شہیر کی اس حرکت پر 'ہمت احتجاج' کے بعد ہی شائع ہوئیں۔ (دیکھئے مکاتیب سیّد ابوالاعلیٰ مودودی حصہ دوم، مکتوب نمبر ۲۲۱ بنام عاصم نعمانی)

۵ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، ہندوستان کا صنعتی زوال اور اس کے اسباب، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۱۹۸۸ء، ص ۶۶-۶۵

۶ ایضاً ص ۷۹

۷ ایضاً ص ۴۳

۸ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، بینکنگ اور انشورنس، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی، ۲۰۱۰ء ص ۴

☆☆☆